جنوری فروری 52ء

# المنار



تعلیم الاسلام کالج ربوہ

6
11-12
52
28065

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# روشنی اور بلندی کا نشان

# المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

جنوری فروری ۱۹۵۷ء ——— جلد ۶ شمارہ نمبر ۱۱-۱۲

نگران :- پروفیسر محبوب عالم خالد

ترتیب دینے والے :-

ناصر احمد پرویز

ایاز محمود احمد خان

لطف الرحمٰن محمود احمد

● پرنٹر و پبلشر :- اے آر جنید ہاشمی ● مطبع :- ضیاء الاسلام پریس ربوہ ● مقام اشاعت :- تعلیم الاسلام کالج ربوہ

# اداریہ

موجودہ دور میں سائنسی ایجادات، اور ایٹمی توانائی کی دریافت نے زندگی کی رفتار بہت تیز کر دی ہے اور دنیا بڑی سُرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہی ہے جس کی انتہا کیا ہوگی؟ کسی کو معلوم نہیں۔ (خدا کرے انسانوں کے حق میں بہتر ہی ہو۔)

زمانے کا ہاتھ سب کے ساتھ برابر کا سلوک نہیں کرتا۔ اگر کوئی انسان اپنے آپ کو زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا سکھا لے تو وہ زمانے کی برق رفتاری کے ساتھ بڑی سرعت سے ترقی کی منازل طے کر لیتا ہے لیکن اگر کسی انسان میں یہ جوہر پیدا نہ ہو سکے تو وہ کچلا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو زمانے کے ساتھ چلنا سکھائیں ورنہ ہمارا وہی انجام ہوگا جو اس بوڑھے شخص کا ہوتا ہے جو انسانوں کے سمندر میں گر کر ان کے ساتھ ساتھ چلنے کی سکت نہ رکھتا ہو۔

تعلیم کا حصول اس سلسلہ میں سب سے پہلی کڑی ہے۔ اگر طلباء تعلیم کے حصول کی طرف پورا تندہی کے ساتھ توجہ کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قابل نہ ہو سکیں۔ یہ چیز صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب طلباء کے اندر احساس ذمہ داری پیدا ہو جائے ——— پس ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے اندر احساسِ ذمہ داری پیدا کریں اور صحیح رنگ میں تعلیم حاصل کریں تا زمانہ ہمیں کچلنے کی بجائے ہمارے ساتھ چلنے پر مجبور ہو سکے

سے لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو!

(ن ـ ح ـ ب)

# جو بادہ کش تھے پُرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

۱۲ر جنوری ۱۹۵۷ء کی غمناک صبح کو آسمانِ احمدیت کا ایک اَور درخشندہ ستارہ غروب ہوگیا۔ یعنی حضرت مسیح پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مخلص اور قدیم صحابی، اور عاشقِ صادق حضرت مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ!

حضرت مفتی صاحبؓ نے اسلام اور احمدیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے جس جانفشانی اور عرقریزی کے ساتھ خدمات سرانجام دی ہیں مستقبل کا اسلامی مؤرخ انہیں فراموش نہیں کر سکے گا اور انہیں سنہری حروف میں لکھا جائے گا تا آنے والی نسلیں اِس عظیم مجاہد کے عظیم کارناموں سے روشناس ہو سکیں۔!

حضرت مفتی صاحبؓ ایک کامیاب مبلّغ، ایک کامیاب مقرّر، ایک کامیاب ماہرِ تعلیم اور ایک کامیاب انسان تھے۔ ان کا ایسے وقت میں جماعت سے جُدا ہونا جب جماعت مصائب و مشکلات کے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے ایک بہت بڑا ابتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ جماعت کی حفاظت فرمائے جس کے سہارے اِک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں۔

ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؓ کو اعلیٰ علیّین میں جگہ عطا فرماوے اور اُنہیں اپنے محبوب حضرت مسیح پاک علیہ السلام اور اُن کے طفیل حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا قُرب نصیب ہو! تا اُن کی دلی خواہش پوری ہو! اور اللہ تعالیٰ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور ان کا حافظ و ناصر ہو!

ادارۂ المنار، تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ اور طلباء کی طرف سے دردمندانہ دُعائیں پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حضور دست بدعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جماعت کو حضرت مفتی صاحب مرحومؓ جیسے مخلص اور بے لوث کارکن عطا فرماوے تا اسلام اور احمدیت بہت جلد چار دانگ عالم میں پھیل جائے اور تمام روئے زمین پر کوئی دین نہ ہو مگر دینِ اسلام اور کوئی کتاب نہ ہو مگر قرآن! اور پھر تمام دُنیا اسلام اور احمدیت کا علم لہرانے لگے۔

---

(حضرت مفتی صاحبؓ کی وفات پر احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن اور فضل عمر ہوسٹل کی قراردادیں شریکِ اشاعت ہیں۔)

مولانا صلاح الدین احمدؒ ایڈیٹر ادبی دُنیا

# ہماری زبان اور ادب کے چند مسائل

(یہ مقالہ موصوف نے بزمِ اُردو تعلیم الاسلام کالج ربوہ کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۵۶ء میں پڑھا)

ہندوستان کی مقلسی کی کہانی اور زبانِ اُردو کی تاریخ درحقیقت ایک ہی داستان کے دو نام ہیں۔ جن صاحبوں نے ہماری گزشتہ دو تین صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ امر مخفی نہ ہوگا کہ اُردو اور غریبی کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ وہ غربت کی آغوش میں پیدا ہوئی اپنے پالنے میں اس نے وہی لوریاں سُنیں جو عوام کے محبوب فقراء اور صلحاء کے کلام سے ماخوذ تھیں، اُس کلام سے جو دلوں سے نکل کر دلوں میں گھر کر لیتا اور محض اپنی فطری ترکیب اور اپنے خلوص کی بدولت خلقِ خدا کی زبان پر جاری ہو جاتا تھا۔ اس کا بچپن تنگ و تاریک گلی کوچوں اور شکستہ و بوسیدہ مکانات کی صحنچیوں اور دالانوں میں کھیلتے کودتے گزرا اور جب نامِ خدا وہ جوان ہوئی تو ہر خاص و عام کی نگاہ اس پر پڑنے لگی۔ لیکن خواص اب بھی اُسے قریب بُلاتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ اٹھارویں اور اُنیسویں صدی کے خواص پر فارسی کا سیاسی اور تہذیبی غلبہ اُسی طرح طاری تھا جس طرح آج انگریزی کا غلبہ اس مُلک میں انگریزی اقتدار کے بظاہر ختم ہو جانے کے باوجود نہ صرف طاری بلکہ روز افزوں ہے۔ خواص سے میری مراد محض وہ لوگ نہیں ہیں جو کسی سوسائٹی میں اپنی ذاتی دولت یا اپنے موروثی مناصب و املاک یا اپنی خاندانی روایات کے باعث عوام سے جُدا ہوئے اور ایک کم و بیش جداگانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ بلکہ وہ افراد بھی ہیں جو کسی معاشرے میں ذہنی اور تہذیبی طور پر بھی ایک علیحدہ اور ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی قسم کے ایک فرد نے کہ ذہنی خواص کے حلقے میں ایک مقامِ امتیاز کا مالک تھا، اُنیسویں صدی کے نصف کے قریب اندوہ فخرِ مباہات کہا تھا کہ ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

لیکن یہ اندازِ نظر اور یہ اظہارِ تفاخر دونوں بہت جلد فنا پذیر ہو گئے اور آج ایک صدی کے بعد غالب کا جو کلام زندہ ہے اور جو نہ جانے کتنی صدیوں تک زندہ و پائندہ رہے گا وہ اُس کا مجموعۂ اُردو

ہی ہے، جو اس کی بقا آثار نظم و نثر دونوں پر حاوی ہے اور جس کی قدر و قیمت میں مرورِ ایام کے ساتھ برابر اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غالب کا فارسی کلام کسی اعتبار سے اس کی اُردو نگارشات سے فروتر ہے، ہرگز نہیں، بلکہ مدعائے گزارش محض یہ ہے کہ غالب اُسی ملک کا ایک باشندہ اور اُسی سوسائٹی کا ایک فردِ خاص تھا، جس کے عوام کی زبان اُردو تھی۔ اور اگرچہ اسکے اپنے زمانے کے خواص و عوام نے اس کے اُردو کلام کی قدر نہ پہچانی اور خود اس کی اپنی نظر میں بھی یہ کلام پسندیدہ وقیع نہ تھا لیکن جب زمانے نے کروٹ بدلی اور عوام کے فہم و فراست کی سطح فطری اور لازمی طور پر بلند ہوئی تو انہوں نے اپنی زبان کے شاعرِ اعظم کو آخر وہی مرتبہ دیا جس کا وہ حقدار تھا۔ اور اسکے مضامینِ نظم و نثر کی ویسی ہی قدر کی جیسی کہ ہونی چاہیئے تھی۔ رہا وہ فارسی کلام جس پر خود شاعر کو فخر و ناز تھا تو ہندوستان میں اسلامی سلطنت و سیادت کے ختم ہوتے ہی وہ معاشرہ بھی ختم ہو گیا، جس کے کم از کم خواص غالب کے زمانے تک فارسی کے قدردان یا اس سے آشنا تھے۔ پھر فارسی کلام کی قدر کون کرتا اور زندگی کے در و دیوار پر اس کا سراغ کون لگاتا ؎

اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

اور خود اہلِ ایران کی یہ کیفیت ہے کہ ہندوستان کے فارسی شعراء یا نثر نگاروں میں سے انہوں نے ایک خسرو کے سوا کسی کو تسلیم ہی نہیں کیا اور وہ کیوں کریں اور ہمیں کیا حق ہے کہ اُن سے پوچھیں کہ وہ ایسا کیوں نہیں کرتے؟

اور حضرات! یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے، عہدِ حاضر کے اُن خواص کے لئے جو آج اپنی زبان کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ اور اپنے گذشتہ فرنگی حاکموں کی زبان کو اپنے سینے سے لگائے اور اپنی زبانوں پر چڑھائے پھرتے ہیں اور اگر جہان میں کوئی خسرو، کوئی فیضی، کوئی بیدل، کوئی غالب اور کوئی گرامی نہیں ہے۔ اور اگرچہ یہ امر بے حد مشکل اور قریب قریب محال ہے کہ وہ انگریزی میں صاحبِ تصنیف ہو سکیں یا کم از کم اہلِ زبان کی سی زبان بول یا لکھ سکیں، تاہم وہ اپنی اور بچوں کی بہترین توجہ انگریزی کے حصول پر صرف کرتے اور کرواتے اور اسی نسبت سے خود اپنی زبان کی طرف سے تغافل و تساہل میں ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ دن بھی بہت جلد آنے والا ہے جب یہ دھوپ بھی اُس آفتاب کے ساتھ رخصت ہو جائے گی جو ایک زمانے میں کبھی غروب نہیں ہوتا تھا اور جو اب خود اپنے وطن کے گہرے بادلوں میں سے بھی کبھی کبھی جھانکتا ہے۔

حضرات! اِس گزارش سے میرا منشا انگریزی کی تنقیص ہرگز نہیں ہے، میں اُسے اُردو کے بعد عہدِ حاضر کی سب سے ترقی پذیر زبان یا بالفاظِ دیگر مغرب کی اُردو سمجھتا ہوں۔ آپ میں سے بعض حضرات شاید میری اس عبارت پر مسکرا دیں لیکن وہ اگر ذرا غور

فرمائیں تو یہ حقیقت خود بخود اُن پر عیاں ہو جائیگی کہ دورِ حاضر کی زبانوں میں سے اگر کوئی زبان ترقی پذیری میں اوّلیت کا دعویٰ کر سکتی ہے تو وہ بجا طور پر اُردو زبان ہی ہے۔ السنۂ عالم میں اِس اعتبار سے انگریزی کا نمبر عین اس کے بعد آتا ہے کہ وہ بھی اپنی ترکیب میں کم و بیش وہی خصوصیات رکھتی ہے جو اِس لحاظ سے اُردو کو حاصل ہیں اور جس کے باعث وہ دنیا کی آسان ترین زبان قرار دی جا چکی ہے۔ مشرقی نصف کُرّے میں تنجیر سے لے کر شنگھائی تک چلے جائیے، آپ کو ہر شہر اور ہر بندرگاہ میں اُردو اور اُردو کے بعد انگریزی کے بولنے والے باقی سب زبانوں کے بولنے والوں سے زیادہ تعداد میں ملیں گے۔ میرے ایک مرحوم دوست نے برما کے شہر مانڈلے کا ایک واقعہ مجھے سُنایا۔ وہ ایک چینی قہوہ خانے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ایک چینی گاہک قہوہ خانے میں داخل ہوا اور وہ ملازم چینی لڑکے سے خطاب کر کے کہنے لگا کہ "چائے لاؤ، میٹھا کم"۔ میرے دوست کا بیان ہے کہ وہ ایک چینی کی زبان سے دوسرے چینی کو اُردو میں خطاب کرتے ہوئے دیکھ کر اِس قدر حیرت زدہ ہوئے کہ کچھ عرصہ تک بالکل گم سُم بیٹھے رہے۔ پھر ہمت کر کے اُٹھے اور قہوہ خانے کے مالک کے پاس جا کر کہنے لگے کہ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے اِس معزز چینی سرپرست نے آپ کے ملازم لڑکے کو چائے لانے کا حکم اُردو میں کیوں دیا ہے؟

مالک یہ سُن کر مُسکرایا اور کہنے لگا کہ صاحب! یہ اور یہ لڑکا دونوں شمالی چین کے باشندے ہیں اور یہ صاحب جو ابھی داخل ہوئے ہیں جنوبی چین کے رہنے والے ہیں اور ہم ان کی اور یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے، اسلئے ہم مجبوراً اُردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اور حضرات! مجبوری کی یہ بات چیت آج پشاور کے قصہ خوانی کے بازار سے لیکر لاڑکانے اور حیکیب آباد کی منڈیوں تک اور کراچی کی بندر روڈ سے لیکر ڈھاکہ کے پلٹن بازار تک ایک طرف اور امرتسر کے دربار صاحب سے لیکر کلکتہ کے کالی مندر تک اور شملہ کی چوٹیوں سے لیکر کوڈائی کنال کی نزہت گاہوں تک دوسری جانب، یکساں روانی اور یکساں دلپذیری کے ساتھ جاری ہے جبکہ زبانوں پر یہ نعرے ہیں کہ اُردو ہم میں سے کسی کی زبان نہیں اور ہم پشتو اور پنجابی اور سندھی اور بلوچی اور بنگالی اور ہندی اور گجراتی اور مرہٹی اور تامل اور کناری کے سپوت اپنی اپنی زبانوں کے تحفظ کے لئے اپنے اپنے خون کے آخری قطرے بہا کر ہی دم لیں گے ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

لیکن بات اُردو اور انگریزی کے تقابل اور ترقی پذیری سے چلی تھی اور میں یہ کہہ رہا تھا کہ ہم خادمانِ اُردو انگریزی کے ہرگز ہرگز مخالف نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس یہ چاہتے ہیں کہ علوم و فنون کا جس قدر سرمایہ ہم انگریزی کے مخازن سے اُردو میں

منتقل کر سکیں، ہمارے لئے اسی قدر بہتر ہوگا لیکن یہ
اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے لوگوں
میں سے بہت سے لوگ خود اپنی زبان صحت اور قاعدے
کے ساتھ لکھنے پر ویسے ہی قادر ہوں جیسے وہ انگریزی
کے مطالب سمجھنے پر قادر ہوتے ہیں، اور یہ اپنی باری پر
پھر اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اجتماعی پیمانے پر
اپنی قومی زبان کو اپنی سنجیدہ توجہ کا کم از کم اتنا حصہ
ضرور دیں جتنا ہم انگریزی کو دیتے ہیں۔

توجہ کی سنجیدگی کے ذکر سے ذہن معاً اُس
اندازِ نظر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو ہم نے اپنی
زبان کے بارے میں اختیار کر رکھا ہے اور جسے
تفریحی اندازِ نظر کے سوا اور کوئی نام نہیں دیا
جا سکتا۔ ہم میں سے اکثریت کی اُردو زبان سے
دلچسپی محض اس قدر ہے کہ ہم مشاعروں یا ریڈیو پر
اس زبان میں گائی ہوئی غزلیں سُن لیتے ہیں یا اپنا وقت
گزارنے کے لئے چند نشہ آور نام نہاد تاریخی ناول
پڑھ لیتے ہیں یا پھر اُردو اخبارات کے تفریحی کالموں
اور معمّا باز رسائل کی ارزاں کہانیوں سے لطف اندوز
ہونے کی مساعیٔ جمیلہ کو مطالعۂ اُردو کا نام دیکر
ثوابِ دارین کے حصول کی مہم سر کر لیتے ہیں۔ ہمارے
برسرِ کار اور برسرِ اقتدار اعلیٰ طبقے کو اپنی قومی زبان
بلکہ اُس زبان سے جس کی نسبت بیس برس کے بعد
سرکاری زبان بن جانے کا ایک برائے نام اندیشہ
بھی موجود ہے، اتنی بھی دلچسپی نہیں، کیونکہ اس طبقے
کے خبردار ارکان یہ جانتے ہیں کہ بیس برس کا یہ عرصہ
وعدۂ محبوب سے زیادہ وقیع نہیں ہے اور یہ ایک
حقیقت ہے کہ اِس وعدہ کے داخلِ دستور ہونے
کے وقت ہماری قومی اسمبلی کے اُن بیشتر اراکین نے
جن کا تعلق مغربی پاکستان سے ہے، خاموشی ہی کو
بہترین حکمتِ عملی سمجھا تھا۔ چنانچہ موعودہ تبدیلی کے کوئی
آثار پیدا نہیں ہیں اور اُردو کو بتدریج انگریزی کی
جگہ دینے کے لئے جو اقدامات لازم تھے اُن میں سے
کسی کا نشان کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کے خلاف قوم
کی نژادِ نو کو جو موجودہ اعلیٰ طبقے کی جانشین بننے
والی ہے شروع سے انگریزی اور مسیحی تعلیم دی جا رہی
ہے تاکہ وہ زندگی کی اُن تمام صفات سے متصف
اور اُن بیشتر خصوصیات سے آراستہ ہو جائے
جو اِس ملک میں صاحبیت اور حاکمیت اور ان کے
لوازم کے لئے ضروری تصوّر کی جاتی ہے۔ اعلیٰ طبقے
کی دیکھا دیکھی ہمارا متوسّط اور نچلا متوسّط طبقہ بھی
اپنی اولاد کو شروع سے انگریزی تعلیم دلانے کیلئے
سراپا اضطراب ہے۔ چنانچہ مسیحی مدارس کے طلباء
کی موجودہ تعداد سے اُس تعداد سے کوئی نسبت
نہیں رہی جو خود فرنگی اقتدار کے زمانے میں پائی جاتی
تھی۔ انگریز کے اِس ملک سے رخصت ہو جانے کے بعد
ہمیں اُس کی تہذیب سے والہانہ عقیدت پیدا ہو گئی
ہے۔ اور اس تہذیب کے فروغ کے لئے ہم انگریزوں
کی بنیادی تعلیم کو جو حقیقۃً ہمارے بچّوں کی سیرت کے
ارتقاء، اُن کے مجلسی مفاد اور اُن کے مستقبل کے
تقاضوں کے لئے چنداں مفید نہیں ہے، بڑی ضروری

اور بڑے کام کی چیز تصوّر کرتے ہیں۔ مگر یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے اور بڑی تفصیلی بحث کا طالب ہے۔ یہاں اِس کا ذکر اور وہ بھی محض ضمناً صرف اسلئے آگیا ہے کہ ہماری زبان کی ترقی اور اس کے فروغ کے راستے میں جو رُکاوٹیں حائل ہیں اُن کا ایک باعث ہمارے اہلِ اقتدار اور برسرِ کار طبقے کی وہ مخالفانہ روش ہے جو اُنہوں نے اُردو کے بارے میں اختیار کر رکھی ہے اور جس کا ایک نتیجہ اُس تعلیم کا زائد از ضرورت فروغ دوام ہے جو ملک کے آئندہ رہبروں کو ایک غیر قوم کے تہذیبی تصوّرات سے وابستہ رکھے گی اور اپنی قوم اور اس کی زندگی سے دُور کرتی چلی جائے گی۔

انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کی بلاشبہ ایک خاص طبقے کو ضرورت ہے، مگر یہ طبقہ وہ ہے جو ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور جو علوم طبیعات کے تحقیقی مدارج تک پہنچ جاتا ہے۔ اِس سطح سے اُتر کر بین الاقوامی روابط کی ضروریات ہیں، اور یہ بھی انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کی طالب ہیں۔ قومی زندگی کی یہ دونوں شقیں اگرچہ نہایت ضروری ہیں لیکن ان میں جذب ہونے والے طلباء کی تعداد ہر ملک میں نہایت محدود ہوتی ہے اور اُن کی کل تعداد سے محض ایک خوردبینی نسبت رکھتی ہے۔ ملک و قوم کی عام ضروریات خواہ وہ علمی ہوں یا انتظامی دنیا کے قریب قریب ہر ملک میں اس کی اپنی ہی زبان پوری کرتی ہے اور یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ ہماری قومی زبان اُردو میں ان ضروریات کے پورا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔

غور کیجئے تو اس کے ثبوت کے لئے دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اُردو کی کُل عمر اڈھائی سَو برس سے زیادہ نہیں۔ جو دُنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلے میں بے حد کم ہے۔ پھر اس میں نثر کی ابتدا کو محض ڈیڑھ سَو برس گزرے ہیں اور سنجیدہ نثری نگارشات کی زیادہ سے زیادہ عمر پچھتّر برس سے زائد نہیں۔ نثرِ جدید یعنی ماڈرن اُردو کا آغاز خود اِسی صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا اور اعلیٰ تعلیمی ضروریات کے لئے کتابیں مدوّن یا ترجمے کے ذریعہ منتقل کرنے کی پہلی منظّم کوشش کی ابتدا کو ابھی بمشکل تیس بتیس برس ہی گزرے ہیں۔ یہ کوشش سنہ ۱۹۲۰ء کے قریب قریب عثمانیہ یونیورسٹی اور دارالترجمہ حیدرآباد کے قیام سے شروع ہوئی، اور سنہ ۱۹۴۸ء میں سقوطِ حیدرآباد کے ساتھ ہی ختم ہوگئی لیکن دیکھئے اِس رُبع صدی کے دوران میں حیدرآباد کی تعلیمی تحریک کے براہِ راست یا بالواسطہ اثر سے مختلف علوم و فنون کی کتنی اعلیٰ پایہ کتابیں ہماری زبان میں تالیف و ترجمہ ہوئیں۔ اور علوم حاضرہ کیسی خوبی سے اُردو میں منتقل ہو کر طلباء اور شائقین کی ذہنی جِلا کا باعث ہوئے۔ اقتصادیات کے مشہورِ عالم پروفیسر برج نرائن جو میرے شفیق استاد تھے مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ حیدرآباد

کے بی۔ اے کے طلباء اپنے امتحانی پرچوں میں دوسری یونیورسٹیوں کے طلباء کی بہ نسبت حقائقِ علمیہ کے جذب کا بہت بہتر ثبوت دیتے ہیں اور میری رائے میں یہ اہلیت علم کو اپنی زبان میں حاصل کرنے ہی کا نتیجہ ہے۔

حضرات! انگریزی کی عمر بلاشبہ اُردو سے بہت زیادہ ہے۔ فارسی کی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ عربی تو اُمّ الالسنہ ہے۔ لیکن کلاسیکی ادبیات کو چھوڑ کر کہ ابھی ہماری زبان کی عمر کلاسیکی تقسیم کے قابل ہی نہیں ہوئی، اظہار کی وہ کونسی قوت اور بیان کی وہ کونسی نزاکت ہے، جس سے ہماری زبان محروم ہے۔ ہم نے عربی کی بلاغت و شوکت کے ساتھ فارسی کی شیرینی اور صفائی اور ہندی کا لوچ اور نکھار ورثے میں پایا ہے۔ پھر وہ روایات ہمیں مفت میں ملی ہیں جو اِن زبانوں کے تہذیبی سرمائے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس کے بعد انگریزی کا نمبر ہے۔ انگریزی سے ہمیں آشنا ہوئے کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شاید بمشکل پچھتر برس ہوئے ہوں گے۔ لیکن دیکھئے الفاظ کی کتنی صورتیں، اظہار کے کتنے طریقے بیان کے کتنے اطوار جو اصلاً فرنگی نژاد ہیں، کیسے نامعلوم انداز میں چپکے سے ہماری زبان کے اجزاء بن گئے ہیں۔ یہ موضوع بھی ایک جداگانہ بحث کا طالب ہے۔ لیکن مَیں آپ کو اِس بات کا یقین دلاتا ہوں کہ ہم نے عربی اور فارسی اور ہندی کی طرح خود انگریزی سے بھی بے نہایت استفادہ کیا ہے اور یہ استفادہ اُس اعجاز آفریں جذب کا مرہون ہے جو زبانِ اُردو کی خصوصیت اوّلین ہے اور جس کے سبب سے یہ آج دُنیا کی سب سے زندہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے ہاں سنجیدہ اور اعلیٰ پائے کی علمی کتابوں کی بہت کمی ہے۔ لیکن اس میں خود ہمارا قصور ہے، ہماری زبان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اُردو وہ تمام صلاحیتیں رکھتی ہے جو علومِ قدیمہ و جدیدہ کے انجذاب و اظہار کے لئے موزون و مناسب ہیں اور جیسا کہ مَیں پہلے اشارہ کر چکا ہوں اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری زبان خود اپنے ذخیرۂ الفاظ اور اپنی طاقتِ بیان کے علاوہ اپنے اندر کم از کم چار زبانوں کے ذخائرِ الفاظ اور قوائے بیان پنہاں رکھتی ہے اور انہیں سلیقے سے استعمال کرنے کی جو دہی خوبی اِسے عطا ہوئی ہے اُس نے اِسے دُنیا کی آسان ترین زبان بنا دیا ہے۔ اب اگر نیتیں بخیر اور ارادے درست ہوں اور کم از کم مملکت کے مغربی حصّے میں اُردو کو واقعی قومی اور سرکاری زبان بنا دینے کے وعدے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا منظور ہو اور اس مبارک عزم کے شواہد سامنے آجائیں تو آپ دیکھئے گا کہ اِس گئی گذری حالت میں بھی قوم کی صلاحیتیں پھر سے بیدار ہو جائیں گی اور علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کا ایک نیا دَور شروع ہو جائے گا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہمارا موجودہ علمی جمود زیادہ تر اُس بے یقینی سے پیدا ہوا ہے جو ہمارے اربابِ اقتدار کے بے غرضانہ بلکہ ایک بڑی حد تک مخالفانہ رُجحانات کا نتیجہ ہے۔

اگر ہمیں بیس برس کے عرصے میں اُردو کو وہی حیثیت دینی ہے تو ہمارا کوئی لمحہ اس اقدامِ عظیم کی تیاری اور تدریجی تکمیل سے خالی نہیں ہونا چاہیئے۔ ہر سال ہزاروں علمی کتابیں شائع ہو کر طلباء اور شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جانی چاہئیں اور تحفظ علوم وفنون کی تعلیم میں ذریعۂ تعلیم کی تبدیلی اور انتقال کا تدریجی عمل فوراً شروع ہو جانا چاہیئے۔ ادھر دفاتر اور کاروبار کے روزمرّہ معاملات میں اُردو کے داخلے اور استعمال کو نہ صرف جائز بلکہ مستحسن قرار دینا لازم ہے۔ تاکہ اہلِ کار کی استعدادِ زبان برابر بڑھتی اور آہستہ آہستہ انگریزی کی جگہ لیتی جائے۔ ورنہ یہ بات قطعاً ناممکن ہے کہ آج سے ساڑھے انیس برس کے بعد ایک روز دفعۃً طلوعِ آفتاب کے ساتھ اُردو کا خورشید جہاں تاب بھی طلوع ہو جائے۔ قومیں اپنے مقاصد یوں نہیں حاصل کیا کرتیں اور فطرت انہیں اپنے تحائف قاب میں لگا کر کبھی پیش نہیں کرتی۔ ہمیں اپنے مقصدِ عزیز کے حصول کے لئے ایک باقاعدہ منصوبہ بنانا اور اس کی تمام جزئیات پر روز و شب عمل کرنا ہے۔ ہمیں اپنا چراغِ شب جلانا اور اس کی روشنی میں خونِ جگر ٹپکانا ہے۔ ہمیں اپنی منزلِ مقصود کا فاصلہ ناپ کر اُسے طے کرنے کے لیے ہر روز چند قدم اُٹھانا اور اپنے عَلَم کو بڑھانا ہے ؎

اور یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

حضرات! اس میں کلام نہیں کہ حکومت کے تعاون اور تائید کے بغیر ہم اپنے تعلیمی نظام یا ترقیٔ زبان کے منصوبے میں کوئی معرکہ آرا تبدیلیاں نہیں کر سکتے لیکن برسرِ اقتدار طبقے کے رجحانات و خیالات کو بدلنے کی کوشش کرنا بھی تو ہمارے فرائض میں داخل ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم اپنی قومی زبان کے معاملات سے کم از کم اتنی دلچسپی ضرور رکھیں، جتنی مثال کے طور پر ہم ایک غیر ملکی کھیل مثلاً کرکٹ یا ہاکی سے رکھتے ہیں۔ اُردو کی اہمیت اور حیثیت اور اسکے مستقبل کے امکانات کے پیشِ نظر یہ امر نہایت ضروری ہے کہ اسے ہمارے ثانوی مدارس میں وہی درجہ دیا جائے جو اب تک انگریزی کو حاصل ہے اور پہلی جماعت سے لے کر ایف اے کے اختتام تک اسکی تعلیم و تدریس لازمی قرار دی جائے اور عربی اور فارسی کے ضمنی مطالعے کو اُردو کے باقاعدہ مطالعے کا ایک حصہ تصوّر کیا جائے۔ یہ وہ کم از کم مطالبہ ہے جو ہمیں اربابِ اختیار سے کرنا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی نجی زندگیوں میں اُردو ہی کو اپنا اوّلین ذریعۂ اظہار بنانا چاہیئے۔ تاکہ وہ تھوڑی بہت جھجک اور اجنبیت جو غیر اُردو داں لوگ اسے بولنے میں محسوس کرتے ہیں نامحسوس طور پر ختم ہو جائے۔ رہا معیار اور صحت کا سوال تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ذوقِ سلیم ہی صحت اور عمدگی کا سب سے بڑا معیار ہے اور مشق ہی وہ استاد ہے جس کے سامنے ہُنر اور مہارت دونوں

زانوئے تلمذ تہ کرتے ہیں - پھر یہ امر بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اب زبانِ اُردو کا مرکز دلّی رہا ہے نہ لکھنؤ، اب اگر کسی شہر و دیار کو اسکی خدمت کا شرف حاصل ہے تو وہ آپ ہی کا علمی مرکز ہے جسے اس شرف کا حامل بنائے رکھنا آپ ہی کی مساعی پر مبنی ہے - زبانیں بنائی نہیں جاتیں، وہ خود بخود بنتی اور بدلتی چلی جاتی ہیں - اُردو کا مرکز اِس خطۂ پاک میں منتقل ہوجانے سے جو نئی کیفیتیں پیدا ہوئی ہیں وہ اس زبان کے مزاج میں خاموشی سے داخل ہوجائیں گی اور ہمارے اور آپکے دیکھتے دیکھتے زندگی کی کوکھ سے نئے نئے الفاظ اور محاورے جنم لیں گے اور آپ کی بول چال کی زبان میں گھُل مِل جائیں گے - یہ ایک فطری عمل ہے اور اس فطری عمل کو روکنا نہ مناسب ہے نہ ممکن - کل تک جو بچے فراش خانے کی گلیوں میں کھیلتے تھے آج وہ شاعر عالم اور حسین آگاہی کے بازاروں میں زندگی سے پنجہ آزمائی کرتے ہیں اور زندگی انہیں اظہار کے نئے طریقے سکھاتی اور بیان کے نئے انداز بتاتی ہے اور اِس طرح زبان کا آبِ رواں زندگی کی ترجمانی اور عکاسی کرتا ہوا نئی وسعتوں اور فراخ تر میدانوں میں مسلسل اور برابر بہتا چلا جاتا ہے -

حضرات! زبان اور محبت پر آج تک کوئی بند باندھا نہیں جاسکا، پس اُن بنیادی اصولوں اور کیفیتوں کے سوا جو ہماری زبان کے قواعد اور مزاج سے خاص ہیں ہمیں زبان کے فروغ اور توسیع پر کوئی قید نہیں لگانی چاہیئے - جو اسالیب اور جو الفاظ اور جو تراکیب زندگی کے تقاضوں سے اس میں داخل ہوں گے اگر وہ اسکے قواعد اور اس کے مزاج کے مطابق ہونگے تو اسمیں سما جائیں گے ورنہ اُسی خاموشی سے نکل جائیں گے جس خاموشی سے وہ اسمیں داخل ہوئے تھے - البتہ ہمارے فضلا اور ثقات کا یہ فرض ہے کہ وہ زبان میں طغیان اور غدر کے امکانات پر ایک کڑی نگاہ ضرور رکھیں اور اُنہیں جہاں سر اُٹھاتے دیکھیں وہیں دبا دیں، اور ادب کے ایوان میں ہرگز داخل نہ ہونے دیں -

حضرات! میں نے اپنی اِن گذارشات میں ابتک کہیں ادب کا نام نہیں لیا تھا، اب ادب کا ذکر آیا ہے تو چند باتیں ادب اور اسکے موجودہ رجحانات کی نسبت عرض کرکے آپسے رخصت چاہوں گا -

پچھلے دنوں ہمارے ہاں یہ بحث بڑے زور سے چل رہی تھی کہ ادب میں جمود طاری ہے یا نہیں اور اگر طاری ہے تو کیوں - اب کچھ دنوں سے پھر ایک پرانا موضوع زندہ ہوگیا ہے کہ وہ ادب صحیح ادب ہے جو محض برائے ادب ہو یا وہ ادب بہتر ہے جو زندگی کے بعض اصولوں اور مقاصد کی ترجمانی کرے میری ناچیز رائے میں یہ دونوں باتیں ایک بڑی حد تک صحیح اور ایک اس سے بھی بڑی حد تک محض غلط ہیں - اِس گذارش کی توضیح کیلئے خود ادب کی تعریف غالباً ضروری ہوگی - میرے عقیدے کے مطابق کوئی ایسی نگارش ادب کے دائرے میں نہیں آتی جو اپنی تخلیق

میں ایک رُوحانی اور اظہار میں ایک جمالیاتی کیفیت نہیں رکھتی۔ مذکورہ بحث کے جائزے میں ادب کی اگر اس تعریف کو زیرِ نظر رکھا جائے تو مذکورہ مباحث کا ایک بہت بڑا حصّہ نہ صرف خود بخود ختم ہو جاتا ہے بلکہ اُن بیشتر قلم کاروں سے ادیب ہونے کے وہ دعاوی بھی چھن جاتے ہیں، جن کی بنا پر وہ گروہ بندیاں کرتے، جماعتیں بناتے، فقرے ایجاد کرتے اور اپنی تنظیمات کو غلبہ دلانے کی مساعی کرتے رہتے ہیں تخلیقِ ادب ایک رُوحانی پکار ہے جو اپنی اوّلین کیفیت میں ایک خاص مزاج کی طالب ہوتی ہے اور جب اُسے مزاج مناسب مِل جاتا ہے تو پھر وہ اپنے اظہار کے لئے جمال کی جستجو میں ذریعۂ اظہار یعنی زبان کا دیوانہ وار جائزہ لیتی اور اپنے مقصد میں اُسی حد تک کامیاب ہوتی ہے جس حد تک اس کی فطری قوّت اور اس کی ریاضتِ تلاش اس کا ساتھ دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا عمل ایک خالص انفرادی کیفیت رکھتا ہے کہ اس کیفیت سے کسی بستانِ ادب کے تقاضوں یا کسی جماعتی مقصد کی تکمیل کا کام نہیں لیا جا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں فنکار یا ادیب کا نہ یہ منصب ہے نہ مقصد کہ وہ بعض ادبی روایتوں کو آگے بڑھائے یا بعض مقصدی سانچوں میں اپنی تخلیقات کو منجمد کر دے۔ ادب ایک آئینہ ہے جو زندگی کی کیفیتوں کی عکاسی کرتا اور ادیب کے رُوحانی اضطراب کی جمالیاتی ترجمانی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ پس وہ قلم کار جو کسی فطری تحریک کے اثر سے نہیں بلکہ ایک روایت یا ایک پروگرام کی تکمیل کیلئے قلم اُٹھاتا ہے، محض ایک کاریگر ہے، اُسے فنکار یا ادیب کہنا گناہ ہے۔ اِسی طرح وہ نگارشات جو زندگی کی مچلتی ہوئی کیفیتوں کو اپنے جمال کے پرتو سے روشن نہیں کرتیں، محض منشیانہ تحریریں ہیں اور انہیں ادب سے کوئی واسطہ یا علاقہ نہیں ہو سکتا۔ اِس حقیقت کو اگر سامنے رکھا جائے تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ادب برائے ادب بہتر ہے یا ادب برائے مقصد۔ زندگی جس طرح ہماری رگوں میں خونِ گرم دوڑاتی ہے اُسی طرح بعض افراد کے افکار و محسوسات میں ایک تموّج پیدا کرتی ہے۔ فکر و احساس کی یہ موجیں اگر اپنے اظہار کے لئے بے تاب ہو کر، نہ کہ کسی روایت یا مقصد یا فرمائش سے متاثر و مجبور ہو کر، حسین و جمیل یا رفیع و بلند الفاظ و اسالیب کا جامہ پہن لیتی ہیں، تو ادب معرضِ وجود میں آجاتا اور ادیب کا فرض خود بخود ادا ہو جاتا ہے۔ دُنیا کے تمام عظیم فنکار اور تمام بلند پایہ ادیب اِسی ایک معیار پر پورے اُترتے اور اِسی ایک منزل پر آکر دَم لیتے ہیں۔

باقی رہا جمود کا سوال تو یاد رکھنا چاہیئے کہ ادب ایک آئینہ ہی نہیں ایک ایسا مقیاس بھی ہے، جو زندگی کی حرارت اور حرکت کی کیفیتوں کا برابر اندراج کرتا رہتا ہے۔ جب زندگی بحیثیت مجموعی رُوحانی تموّج سے محروم ہو جاتی ہے تو ادب کے مقیاس کا پارہ بھی ساکن ہو جاتا ہے اور جب زندگی

میں فکر و جذبات کی آندھیاں چلتی ہیں تو ادب کا بیرومیٹر بھی اُن کے اثرات کو اپنے نقوش میں برابر نمایاں کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ اُردو کے مختصر افسانے کا سنہری دَور وہی دَور ہے جب دونوں عظیم جنگوں کے درمیانی وقفے میں عالمگیر سرد بازاری اور بیکاری نے ہماری معیشت اور معاشرت پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا اور پڑھا لکھا نوجوان طبقہ ایک سوالیہ نشان بن کر رہ گیا تھا، جس کا سماج کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ چنانچہ اسی طبقے کے روحانی اضطراب نے اُن بیمثال فنکاروں کو جنم دیا جنہوں نے ہمارے جدید افسانوی ادب کو دُنیا کی افسانوی ادبیات میں ایک مقامِ امتیاز دلایا۔ یہ محض ایک مثال ہے، لیکن اگر آپ تلاش فرمائیں تو آپ کو ملکی اور غیر ملکی ادب میں ایسی بیسیوں مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن یہاں پہنچ کر وہ نکتہ ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ زبان ہو یا ادب، اُن کی عمومیت، اُن کے گہرے اثرات اور ان اثرات کے اسباب کا سُراغ ہمیشہ اُس عظیم طبقے کی زندگی میں ملے گا جو اُنہیں براہِ راست متاثر کرتا اور خود اُن سے بدرجۂ اتم متاثر ہوتا ہے اور یہ طبقہ اُنہی غربا کا طبقہ ہے، جن کی بولی اور زبان و ادبِ اُردو کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ کل ہم پر فارسی کی امارت کا بادل تھا، آج انگریزی کی سطوت کا سایہ ہے، لیکن خدا نے چاہا تو جس طرح وہ بادل چھٹ گیا اسی طرح یہ سایہ بھی ڈھل جائیگا، اور کسی دن وہ صبح بھی طلوع ہوگی جب ہماری اپنی زبان اور اپنی تہذیب ہمارے اپنے ملک میں کارفرما ہوگی اور ہم اس کے نُور و ظہور کی سعادتوں میں اپنا مقدر تلاش کریں گے۔

؎ چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

---

## انسانیت دوراہے پر!

### (بقیہ از ص ۱)

انسان نے آسمان کی لامحدود فضاؤں میں پرواز کرنا سیکھا۔ اُس نے زمین کی گہرائیوں میں قدرت کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی اور جوہری توانائی کی جدت ایجادات سے افرادِ عالم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے سب کچھ سیکھا لیکن نہیں سیکھا تو زمین پر انسان بن کر رہنا نہیں سیکھا ۔۔۔ انسان کے ایجاد کردہ تباہ کن جوہری ہتھیار عقلِ انسانی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہیں لیکن مستقبل میں اُن کے استعمال کا خدشہ ساری انسانیت کو ہراساں و لرزاں کئے ہوئے ہے۔ لہذا جب تک انسان انسان کو کھاتا رہے گا اور مذہبی تعلیمات کو نظرانداز کرکے بڑی قومیں چھوٹی قوموں کو نگلتی رہیں گی اُسوقت تک عالمی امن کا خواب ہرگز شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا +

# طلبۂ تعلیم الاسلام کالج کے نام

# "پیغام"

---

زبانِ اُردو اِس ملک کے باشندوں کی تہذیبی روایات اور اثرات کا مکمّل اور سچّا مظہر ہے۔ اور یوں بھی اِس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے کہ قومی خودی کو برقرار رکھنے کے لئے قومی روایات کا تحفّظ ناگزیر ہے۔

جہاں تک زبانِ اُردو کی علمی وسعتوں کا تعلق ہے یہ بات نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ کوئی زبان بھی آسمان سے نازل نہیں ہوتی بلکہ یہی تہذیبی روایات اور ماحول اسکی تشکیل کرتا ہے اور علمی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر ہم اپنی زبان کو نظر انداز نہ کریں تو اس میں بڑی صلاحیتیں موجود ہیں اور دراصل تمام زبانوں کا یہی حال ہے۔

ہمارے نوجوانوں کا یہ قومی وملّی فریضہ ہے کہ وہ اپنی تہذیبی روایات سے باخبر ہوں اور ان کی حفظ وبقا کے لئے کوشش کریں تاکہ وہ ملک وملّت کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکیں۔ فقط والسّلام

سیّد عبداللہ

صدر شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

۲۳/۱۱/۵۶

خورشید جالندھری

# غزل

کون سنتا ہے ہماری داستاں تیرے بغیر
کس کو حالِ دل سنائیں جانِ جاں تیرے بغیر

اک تمہارے جانے سے گلشن ہی فقط اجڑا نہیں
ہو گیا ویران میرا آشیاں تیرے بغیر

ایک میں ہی تیری فرقت میں نہیں ہوں اشکبار
چشم پُرنم ہیں زمین و آسماں تیرے بغیر

اب تو سہما ہوا اندھیرا چھا گیا ہے چار سُو
مضطرب ہے آسماں پر کہکشاں تیرے بغیر

موت ہے بے مدّعا اور زندگی بے کار ہے
زندگی کی آرزو ہے رائیگاں تیرے بغیر

اپنے بیگانے سبھی ناراض ہیں خورشید سے
کون ہو سکتا ہے اُس پہ مہرباں تیرے بغیر

عبدالحلیم صادق

# غزل

فرصتِ آگہی نہیں ہوتی
دُور یہ تشنگی نہیں ہوتی

آتشِ غم جگر میں جلتی ہے
درد میں کچھ کمی نہیں ہوتی

مُنہ سے بے سمجھے جو نکلتی ہے
بات وہ کام کی نہیں ہوتی

شامِ غم کے اُداس لمحوں میں
"چاندنی، چاندنی نہیں ہوتی"

ہم نے گھبرا کے کہہ دیا صادق
ہم سے یہ زندگی نہیں ہوتی

عطاء الکریم شاہد

# انسانیت دوراہئے پر!

اگر ہم تاریخِ عالم پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالیں تو ہم پر یہ حقیقت منکشف ہوگی کہ کرۂ ارض کے ظہور پذیر ہونے سے لیکر آج تک نسلِ انسانی امن وچین کی تلاش میں سرگرداں رہی ہے۔ شاید حصولِ سکون بدنصیب انسان کی واحد خواہش ہے جو مکمل طور پر کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکی۔ یہ اہم مسئلہ ہمیشہ اور ہر دور میں بالغ نظر انسانوں اور راہنماؤں کی توجہ کا مرکز رہا ہے لیکن اس کے باوجود انسانیت دولتِ سکون سے بہرہ ور نہیں ہوسکی تسکینِ قلب اُسی وقت میسر ہوسکتی ہے جب ماحول خوشگوار اور سازگار ہو، جنگ کے بادل چھٹ جائیں، مطلع صاف ہو اور آفتابِ امن کی ضیا پاش کرنیں فتنہ وفساد کی ظلمات کو ختم کردیں۔ انسان اشرف المخلوقات ہے مگر اس کی تمام کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس کی ذہنی فوقیت اور برتری خاک میں مل گئی۔ حتیٰ کہ وہ خود بھی خاک میں مل جاتا ہے مگر اس کی یہ آرزو حقیقت کا جامہ نہیں پہنتی۔ آخر وہ کونسی وجوہات اور کونسے اسباب وعلل ہیں جن کی بناء پر تمام اقوام وملل امن کی ہزار تمناؤں کے باوجود اپنی ناکامی کا رونا رونے پر مجبور ہیں؟

اگر حقائق سے قریب ہوکر ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر اظہر من الشمس ہوجاتا ہے کہ دورِ حاضر کا ترقی وتہذیب یافتہ انسان صرف اسلئے اپنے مقاصد میں ناکام ہے کہ وہ مذہبی اقدار کا منکر اور مادیت کی راہوں پر گامزن ہے۔ امنِ عالم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قوموں کے اقوال وافعال میں تضاد ہے۔ آج دُنیا کی تمام قومیں امن امن کے نعرے لگانے کے ساتھ ساتھ اسلحہ بندی کی دوڑ میں مشغول ہیں۔ ان انسانیت کُش سرگرمیوں کی حیثیت بارود کی سی ہے جنہیں بین الاقوامی تنازعات ومناقشات کسی وقت بھی چنگاری دکھا سکتے ہیں۔ امن کے نظریات کو تقویت کے لئے ضروری ہے کہ یہ منافقانہ روش ترک کردی جائے۔ یہ صرف اِسی صورت میں ممکن ہے جب تمام قومیں صدقِ دل سے مذہب کی آغوش میں آجائیں۔ کیونکہ عہدِ حاضر کی سیاست ہاروت وماروت کی سیاسی چالوں کا مجموعہ ہے جو سیاسی راہنماؤں کے اعمال وافکار سے عدمِ دیانت کا جواز پیش کرتی ہے۔ مثلاً جرمنی کا وزیرِ نشریات گوئبلز کہا کرتا تھا کہ جھوٹ بولو، بار بار بولو، حتیٰ کہ لوگ اسے سچ سمجھنے لگ جائیں لیکن مذہب انسان کو اس غیر اخلاقی طریقِ کار سے روکتا ہے۔ پس اقوامِ عالم کے قول و

فعل میں تطابق پیدا کرنے کے لئے مذہب کی اشد ضرورت ہے کیونکہ مذہب چند خیالات و نظریات پر مشتمل ایک خاص زاویۂ نگاہ ہی نہیں بلکہ تمام بانیانِ مذاہب کے اخلاقِ فاضلہ کی عملی مثال ہے۔

کسی انسان کے قول و فعل میں ربط کے علاوہ حق و صداقت اور حق گوئی و بیباکی کے فضائل اُسی وقت اُجاگر ہوتے ہیں۔ جب اُسے کسی بالا ہستی کے احتساب کا خوف دامنگیر ہو۔ ایک جابر و مستبد اور مطلق العنان لامذہب حکمران وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو اس کے بس میں ہوتا ہے۔ اس کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ اس کی مملکت میں قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے ہاتھوں کو ظلم سے دُنیا کی کوئی طاقت روک سکتی ہے تو وہ مذہب ہے۔ روزِ قیامت کا ڈر ہی اس کے افعال کو راہِ اعتدال پر ڈلا سکتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو انسانیت کے عظیم مقام سے روشناس کراتا ہے پس جبتک انسانیت دہریت و الحاد کے تاریک خلاؤں میں بھٹکتی رہے گی اُس وقت تک امن کے قیام کی تمام کوششیں حسرت و یاس میں تبدیل ہوتی رہیں گی۔

دُنیا نے پہلی جنگِ عظیم کی تلخیوں کو محسوس کر کے لیگ آف نیشنز کو جنم دیا تھا تاکہ جنگ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے مگر یہ کسی طاقت و قوت کی مالک نہ تھی۔ چنانچہ یہ ناکام ہو گئی۔ لیگ آف نیشنز کے ناکام ہونے کے بعد یہ خیال یقین کی صورت میں بدلتا جا رہا تھا کہ بین الاقوامی مسائل کے حل کے لئے ایک طاقتور عالمی ادارہ کا قیام ضروری ہے۔ اِس مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مجلس اقوام متحدہ تشکیل دی گئی۔ یہ عالمی انجمن اسلئے معرضِ وجود میں لائی گئی تھی کہ جنگ و جدال کے تحریری خیالات فسانۂ ماضی بن جائیں اور اُن کی بجائے تعمیری نظریات جنم لیں۔ لیکن اِس عالمی انجمن کے قیام کے کچھ عرصہ کے بعد امریکہ کے نام نہاد مہذب، ترقی یافتہ اور جمہوری حکومت نے جاپان کے دو شہروں پر ایٹم بم گرائے جس سے تمام انسانیت کراہ اُٹھی۔ آج بھی اِن شہروں میں ایسے سینکڑوں لوگ ملیں گے جنہوں نے آبادیوں کو ویرانوں میں تبدیل ہوتے دیکھا اور قہقہوں کو آہوں میں ڈھلتے اور پھر معصوم بچوں کو دَم توڑتے ہوئے مشاہدہ کیا۔ دس برس بیت چکے ہیں مگر اُن جوہری دھماکوں کا اثر زائل نہیں ہوا۔ اور اس سال بھی جاپان میں کئی اشخاص ان زہریلے جوہری اثرات کی تاب نہ لا کر موت کا شکار ہو گئے۔

..... یہ سب کچھ تہذیب و تمدن کے اِس دَور میں رونما ہوا جب انسان کو اپنے ذہن رسا پر کامل یقین تھا۔ ظاہری وسیلوں کی موجودگی کے باوجود اقوام متحدہ اِس المیہ کو نہ روک سکی۔ اور اس کی ناکامی کی واحد وجہ مساوات جیسے بُنیادی، اخلاقی اور مذہبی نظریات کا فقدان ہے۔ جب تک اقوامِ متحدہ میں محمود و ایاز، طاقتور و کمزور، حاکم و محکوم اور جابر و مجبور کو برابر نمائندگی نہیں دی جاتی، حقِ استرداد (VETO POWER) کو دائرہ عمل سے خارج

نہیں کیا جاتا اور اسلامی نظریاتِ مساوات کی عظمت کا عملی اعتراف نہیں کیا جاتا اس وقت تک امنِ عالم کا خیال امیدِ موہوم سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

جب ہم اقوامِ عالم کے باہمی تنازعات کا بنظرِ غائر تجزیہ کرتے ہیں تو اُن میں سے اکثر کی تہ میں وطنیت کا تصور کارفرما نظر آتا ہے۔ اگر اقوامِ عالم کسی بھی مذہب پر سچے دل سے کاربند ہو جائیں تو اُن کے اختلافات بہت کم ہو جائیں گے کیونکہ تمام مذاہب کا مرکز اور مقصد ایک ہی ہے۔ نیز وہ جغرافیائی تفریق اور نسلی امتیاز کے نظریات کو تسلیم نہیں کرتے۔ اگر دُنیا میں بسنے والے مذہب کی اِس رُوح کو اپنا لیں تو امریکہ اور جنوبی افریقہ میں سیاہ و سفید افراد کی طبقاتی کشمکش ختم ہو جائے۔

آج تمام اقوامِ عالم ایک دوراہے پر پہنچ چکی ہیں جس کے ایک طرف جنگ کی ہولناکیاں ہیں تو دوسری طرف امن کی خوشگوار فضاؤں کی حکمرانی ہے۔ بدقسمتی سے نسلِ انسانی امن کی خواہش کے باوجود اپنی کوششوں میں کامیابی حاصل نہیں کر سکی کیونکہ اُس نے امن کی شاہراہ پر گامزن ہونے کیلئے مذہبی قوانین کی بجائے اپنی ناپختہ عقل کا سہارا لیا ہے۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ دانشمندانِ اقوام اب اس تلخ حقیقت کا احساس کرنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ کہ ترقی کی معراج سے ہمکنار ہونے کے لئے صرف عقلِ خام کی راہنمائی میں قدم آگے بڑھانا ایک فاش غلطی ہے۔ اور ضروری ہو گیا ہے کہ اب انسانیت تنکوں کی بجائے اس ناخدا کا سہارا لے جسکے اشاروں پر بیسیوں سفینے ڈوبتے اور اُبھرتے ہیں خطۂ ارض پر آباد ہونیوالے باشندے ابتدائے آفرینش سے مشاہدہ کرتے چلے آئے ہیں کہ نوعِ انسانی قدرت کے قوانین اور خالقِ کائنات کے احکامات کو ٹھکرا کر ہمیں ٹھوکریں کھاتی اور بھٹکتی رہی ہے۔ قدم قدم پر نظر آتا ہے کہ جنگ، فتنہ اور خانہ جنگی کی سب سے بڑی وجہ مذہبی اقدار سے انحراف ہے۔ مثلاً الجزائری مجاہدینِ حُریت کا مقدس خون فرانس کی آنکھوں سے اشکِ ندامت بن کر نہیں ٹپکتا اور کشمیر کے غلام مسلمانوں کی زنجیرِ غلامی کٹ کٹ کر نہیں گرتی تو اس کا واحد سبب اقوامِ متحدہ کا وہ طریق کار ہے جو مذہبی نظریاتِ مساوات سے عاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی قانون کی زنجیروں میں ہلکی سی جھنکار پیدا ہوتی ہے جو سونے اور چاندی کے ٹکڑوں کی بلند آواز میں دب کر رہ جاتی ہے۔ پس یہ حقائق اس حقیقت پر شاہدِ ناطق ہیں کہ انسانیت زبانِ حال سے مذہب کی تعلیمات کو آواز دے رہی ہے۔ کیونکہ مادیت اسے گہرائی کی انتہا تک لیجا چکی ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان کی کوششیں سائنس کے میدان میں آسمان کی رفعتوں کو پامال کر سکتی ہے تو امن کا قیام بھی مادی ذرائع سے ممکن ہے۔ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ انسانی ذہن نے انسان کو مادی ترقی کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ (باقی آئندہ)

ڈاکٹر وزیر آغا ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی

# ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے

ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے
ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے
کبھی سرِ کوہ اس کا مسکن
کبھی سمندر کی ہم نشیں ہے
ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے

ہوا کبھی تُند و تیز طوفاں
ہوا کبھی اِک نسیمِ خنداں
کہیں بجھائے ہزاروں دیپک
کہیں منوّر کرے بیاباں
پہاڑ صحرا چمن بیاباں
کبھی کہیں ہے کبھی کہیں ہے
ہوا کی منزل کہیں نہیں ہے

# مکاتیبِ گرامی

غالب مرحوم نے اپنے مکاتیب میں ایک جدّت پیدا کرکے اُردو ادب پر ایک عظیم احسان کیا تھا۔ کسے خبر تھی کہ غالب کے بعد آنے والے ادباء بھی اسی طریق کو اپناتے ہوئے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کرتے رہیں گے۔ ذیل میں چند مشاہیر ادب کے مکاتیب گرامی تاریخ وار درج کئے جاتے ہیں۔ جو اپنے اندر ایک گونا جدّت رکھتے ہیں۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں ——— (ادارہ)

## جناب حامد علی خان۔ مدیر "الحمرا"۔ لاہور

ماڈل ٹاؤن

مورخہ ۶ فروری ۱۹۵۴ء

"دفتر الحمرا"

محترمی۔ السلام علیکم۔ گرامی نامہ ملا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اُسی دن تین بجے مجھے حلقہ ارباب ذوق کے جلسے کی صدارت کے فرائض بھی انجام دینے ہیں۔ انہوں نے آپ سے بھی پہلے مجھ سے وعدہ لے رکھا ہے لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ دونوں جلسے ایک ہی دن ہوں گے۔ لہٰذا گزارش ہے کہ آپ براہِ کرم اپنے وقت مقررہ (۴۵ - ۱ بجے) پر کارروائی ضرور شروع کر دیجئے تاکہ میں ڈھائی بجے سے پہلے فارغ ہو جاؤں اور دوسرے جلسے میں شامل ہونے کا وعدہ پورا کر سکوں۔ چائے کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں مگر محولہ بالا مجبوری کے باعث اس میں شریک نہ ہو سکوں گا جس کا مجھے افسوس ہے۔

نیاز مند

حامد علی خان

## جناب ڈاکٹر ابواللّیث صدیقی ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی لاہور

یونیورسٹی اورنٹیل کالج، لاہور۔ اُردو ڈیپارٹمنٹ
۶ر مارچ ۱۹۵۵ء

محب مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ابھی ملا۔ مَیں ۳ر یا ۴ر فروری کو کوئی ڈیڑھ دو مہینے کے لئے کراچی جا رہا ہوں ایک ضروری کام ہے۔ غالباً مارچ کے آخر یا اپریل کے پہلے ہفتہ میں واپسی ہوگی۔ اس لئے آپ کے پروگرام میں شرکت نہ کر سکوں گا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔

والسلام
آپ کا مخلص
ابواللّیث

## جناب ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ایم اے، پی۔ ایچ۔ ڈی۔ شعبۂ اُردو اورنٹیل کالج۔ لاہور

اورنٹیل کالج لاہور
۱۶ر نومبر ۱۹۵۶ء

خالد صاحب مکرم۔ السلام علیکم

آپ کا خط ملا۔

ہم لوگ انشاء اللہ ۲ر دسمبر کو دہ پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ایک ہفتہ پہلے اس کی تصدیق کر لیجیے گا۔ خدا کرے اُس روز کوئی معروفیت نہ ہو۔ کبھی کبھی ایسے کام نکل آتے ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے ہماری کوشش یہی ہوگی۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

نیازمند
عبادت بریلوی

## جناب ڈاکٹر سیّد عبداللہ ایم۔اے، ڈی لٹ

**یونیورسٹی پروفیسر صدر شعبۂ اُردو پنجاب یونیورسٹی**

اورنٹیل کالج لاہور

۲۳ر نومبر ۱۹۵۶ء

مکرمی محترمی السّلام علیکم

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ حسب ارشاد اُردو کی حمایت میں طلبہ تعلیم الاسلام کالج کے نام ایک پیغام ارسال خدمت ہے۔ اُمید ہے کہ یہ پیغام حسب حال ہوگا۔

اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ فقط

والسّلام

نیازمند

مخلص

سیّد عبداللہ

## جناب مولٰنا صلاح الدّین احمد۔ مدیر ادبی دُنیا لاہور

ادبی دُنیا منزل لاہور

۱۳ر دسمبر ۵۶ء

محبّی و مکرمی جناب پروفیسر عاکف صاحب۔ السّلام علیکم

حسب ارشاد مقالے کی ایک صاف شدہ نقل ارسالِ خدمت ہے۔ ترسیل میں ایک آدھ دن کی دیر ضرور ہوگئی ہے لیکن ع۔ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا۔ ربوہ سے میں آپ کی محبت اور خلوص کا جو نقش لے کر آیا ہوں، وہ انشاء اللہ ہمیشہ میرے دل پر ثبت رہے گا۔

والسّلام

مخلص

صلاح الدین

منظور احمد شاکر

ترجمہ

# دُنیا کے طویل الفاظ

## (ایک انگریز مضمون نگار کے قلم سے!)

وہ لطیفہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا جب ایک اُستاد نے طلبہ سے یہ سوال کیا کہ انگریزی زبان میں سب سے طویل لفظ کونسا ہے؟ تو ایک لڑکے نے جواب دیا "ربڑ" لیکن اُستاد نے کہا لیکن اس میں صرف چھ حروف ہیں، شاگرد نے جواب دیا۔ اسے آپ جتنا کھینچئے پھیلتا ہی جائے گا۔ ایک دوسرے شاگرد کا جواب تھا 'smiles' اس کا مطلب یہ تھا کہ دونوں "S" کے درمیان ایک میل کا فاصلہ ہے۔ ایسا ہی سوال میری جماعت سے کیا گیا تھا کسی طالب علم نے

UNDISTINGUISHABLENESS

کا انتخاب کیا تو کسی نے PHILOPRO-CENITIUENESS کا۔ لیکن میں نے برطانیہ کے شہرۂ آفاق وزیراعظم گلیڈسٹون کا مستعمل لفظ کا انتخاب کرکے انعام حاصل کیا جو ۲۸ حروف پر مشتمل ہے یہ تھا:-

"ANTIDISESESTABLISHMENTARIANISM"

اس کے بعد مجھے طویل ترین الفاظ جمع کرنیکا جنون ہوگیا۔ اس کے بعد سے مجھے سیاست کی کتابوں میں ایک اور لفظ ملا جو یہ تھا:-

"NEOPANPACIFICISTLCALISTICALISM."

اس کے بعد میری نظر ڈرگ ڈکشنری یعنی ڈرگ انسائیکلو پیڈیا کے بعض الفاظ بھی نظر سے گذرے جن کے بیس میں اور تیس تیس حروف تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد ۳۲ حروف پر مشتمل ایک لفظ نکل آیا جو یہ ہے:-

"EBdeONOHYDR [illegible] AERORIDiiODORESCO"

لیکن میری تشنگی نہیں بجھی تھی اسلیے میں ڈکشنری کا طویل ترین لفظ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ خوش قسمت کہ آخرکار یہ لفظ بھی مل گیا۔ جوئندہ یابندہ۔ یہ لفظ بین الاقوامی ڈکشنری میں ایک میڈیکل اصطلاح میں درج تھا۔ جو ایک شخص کی بیماری کا نام ہے۔ جس میں عام طور پر کانوں میں کام کرنے والے مبتلا ہوتے ہیں۔ یہ لفظ صرف ۴۵ حروف پر مشتمل ہے۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ جرمن زبان میں بڑے

لفظ ہیں۔ تھوڑی سی جستجو کے بعد پتہ چلا کہ صادقین کی امداد باہمی سوسائٹی کے لئے ۲۷ حرفی لفظ ہے اور ڈینیوب اسٹیم شپ کمپنی کا نام ۳۳ حروف پر مشتمل ہے یعنی :-

"DONAODAMPFSHIFFAHTSG-ESELLSHAFT."

مجھے کسی ایسے شخص کی تلاش بھی تھی جس کا نام طولِ شب فرقت کو بھی شرمائے۔ جو بندہ یا بندہ کے مصداق مجھے ایک فرانسیسی کاروباری شخص ملا جس کا نام تھا :-

"MOUGAM MADOUCOSSOUM-ARECAR."

لیکن فجی کے ایک شخص کے نام کے سامنے فجی پولیس کے سب انسپکٹر کا نام :-

"BEAM-SENIKAUNIKATONI-MATEKAIRATUSALESIKINI KIKNILAUKINAMOLI-FAVARI"

ایک یونانی پکوان کا نام ۶۹ حروف پر مشتمل ہے جو دنیا کا طویل ترین نام ہے۔ یعنی :-

"LEPADOTEMACHOSELACHOG-ALEOKRANIOLEIPHANODRIM-UPOTRIMMATAKKHLEPKPSS-UPHOPHATTOPERSTERALEKT-RUONOPTCCKEPHALOKICKLO-PEIOLACOSSIRAIOBADHETRAC-ANOPTEROCON."

---

# قراردادِ تعزیت

احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن کا ایک غیر معمولی اجلاس مورخہ ۱۴/۱/۵۷ زیر صدارت جناب مولانا ابوالعطاء صاحب پریذیڈنٹ ایسوسی ایشن چار بجے منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل قرارداد پیش ہو کر متفقہ طور پر پاس ہوئی :-

"ہم جملہ ممبران احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن حضرت ڈاکٹر مفتی محمد صادق صاحب رضی اللہ عنہ کی رنجدہ وفات پر دلی افسوس کا اظہار کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت مفتی صاحب کو جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات عطا فرمائے اور انکے پسماندگان کو صبر جمیل بخشے۔

حضرت مفتی صاحب حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مخلص صحابی تھے اور آپنے ساٹھ برس سے زائد عرصہ نہایت عقیدت اور کامل اخلاص کیساتھ حضرت مسیح محمدی اور آپکے خلفاء کا ساتھ دیا۔ حضرت مفتی صاحب کامیاب جرنیل اسلام ہیں جنہیں دنیا کے مغربی اور مشرقی دونوں حصوں میں بڑے اخلاص کیساتھ خدمتِ اسلام کی توفیق ملی اور خدا تعالیٰ نے انکی مساعی کو بارآور بنایا۔ آپ نئی دنیا امریکہ کے اس عہد میں اشاعت اسلام کے روحانی کونلبس ہیں۔ آپنے دنیا کے کونے کونے میں اسلام کی شمع کو روشن کیا ہے۔ ہماری اللہ تعالیٰ سے عاجزانہ دعا ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کو بلند درجات عطا فرمائے اور احمدیت کی نئی پود کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خاکسار۔ مظفر الدین
سیکرٹری احمدیہ انٹرنیشنل پریس ایسوسی ایشن لاہور

# نظر اپنی اپنی!

المنار میں انشاءاللہ العزیز مختلف تعلیمی مسائل کے متعلق مختلف ماہرین تعلیم کے خیالات شائع کئے جائیں گے۔ اس شمارہ میں "امتحانات میں ناکامی کی کثرت کی وجہ" کے موضوع پر مختلف حضرات کی آراء شامل ہیں۔ جن میں سائنس کے اساتذہ بھی ہیں اور آرٹس کے اساتذہ بھی۔ کالج کے پروفیسر بھی ہیں اور سکول ماسٹر بھی۔ اور طلباء کی آراء بھی درج کی گئی ہیں۔ تاکہ تصویر کے دونوں رُخ قارئین کے سامنے آجائیں۔ ضروری نہیں کہ ادارہ ہر ایک رائے سے متفق ہو۔

ہم کوشش کریں گے کہ یہ سلسلہ جاری رکھ سکیں۔ آئندہ اشاعت میں انشاءاللہ اِس موضوع پر مختلف آراء پیش کی جائینگی کہ "پاکستان میں ذریعۂ تعلیم کونسی زبان ہونی چاہیئے"۔ (ادارہ)

## پروفیسر میاں عطاء الرحمٰن ایم۔ ایس سی۔ ڈین آف سائنس فیکلٹی

امتحانات کے نتائج کی فیصد کمی کے کئی باعث ہیں۔ مگر سب سے اہم باعث پورے معاشرے میں دیانتداری کا فقدان ہے۔ طلباء دیانتداری سے پڑھائی نہیں کرتے کہ اساتذہ بھی مجبور ہوکر بہتر کام کریں۔ اور بہت سے طلباء امتحان میں ناجائز ذرائع استعمال کرکے پاس ہونے کو بُرا نہیں سمجھتے۔ دیانتداری کا یہ فقدان محنت نہ کرنے کا باعث بنتا ہے۔

## پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔ اے۔ ڈین آف آرٹس فیکلٹی

طلبہ کے امتحانات میں کثرت سے فیل ہونے کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک ان کی عدم سنجیدگی ہے۔ جب کوئی شخص سنجیدگی سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کا عزم کرتا ہے تو پھر سنجیدگی سے اس مقصد کے حصول کے لئے خدا کے مقرر کردہ طریق پر عمل کرتا ہے۔ اگر وہ مومن ہے تو سنجیدگی سے دُعا بھی کرتا ہے۔ مگر آجکل عام طور پر نوجوانوں

میں سنجیدگی کا عنصر عنقا ہے۔

طالب علم نے ان کو درحقیقت اپنا مقصد ہی نہیں بنایا۔ سکول اور کالجوں میں درس و تدریس سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتے۔ علم کو اپنے اندر جذب کرنے کے لئے باقاعدگی سے اور محنت سے حصول علم کے طریق پر ان کا عمل نہیں۔ گویا ہر چیز کو ایک کھیل بنایا ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امتحانات میں یہی کھیل اُن پر اُلٹ پڑتا ہے اور وہ خود یا زیچۂ امتحان بن کر رہ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں سچ فرمایا ہے کہ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ انسان کو حقیقی طور پر وہ چیز ہی ملتی ہے اور وہی فائدہ دیتی ہے جس کیلئے وہ سنجیدہ کوشش کرے۔

## محترم میاں محمدؐ ابراہیم صاحب ہیڈ ماسٹر تعلیم الاسلام ہائی سکول ربوہ

اپنے تجربہ کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ سکول یا کالج کی انگریزی کا نتیجہ تبھی اچھا ہو سکتا ہے کہ طلباء خود لکھیں جتنا زیادہ وہ لکھ سکتے ہوں اور اساتذہ اس کی تصحیح کریں جس قدر باقاعدگی اور تواتر سے وہ کر سکتے ہوں۔ اس کے بغیر نتیجہ بہتر ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اسی جذبہ کا فقدان نتائج کی کمزوری کا ذمہ وار ہے۔

## انیس احمدؐ صاحب سال چہارم

یونیورسٹی میں طلبہ فیل کیوں ہوتے ہیں؟ جناب فیل ہونے کا سب سے بڑا سبب دماغی سیر ہے جو طلباء کو دم نہیں لینے دیتی اور انہیں قطب شمالی سے قطب جنوبی تک لئے پھرتی ہے۔ جب ان کے پاس پیسے ہوں تو کبھی خطِ جدی اور کبھی خطِ سرطان پر ہوں گے مگر جب ذرا پیسوں کی خزاں آئی تو خطِ استوا پر یعنی کسی جگہ نہیں ملیں گے بس کمرہ میں ہی اعتکاف بنے بیٹھے رہیں گے اور کتاب کھلی ہوگی لیکن دماغی سیر بدستور جاری رہے گی۔

## منوّر احمد نمی سال دوم

طلباء میں احساسِ ذمہ واری کا بے حد فقدان ہے۔ ہم میں سے تھوڑے ہیں جنہیں یہ احساس ہے کہ ہمارے والدین کن مشکلات میں پڑ کر اور کیا کیا امیدیں لگا کر ہمیں تعلیم دلواتے ہیں۔ اگر ہم اپنے تعلیمی فرائض کو دیانتداری سے ادا کریں اور ان لائنوں پر محنت کریں جو کامیابی کے لئے متعین کی گئی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ طلباء کی اتنی بڑی تعداد ہر سال ناکامی کا منہ دیکھے۔

## کلیم اللہ خاں کرشن سال دوم

طلباء کا یہ کہنا کہ یونیورسٹی میں طلبہ کی زیادہ فیل ہونے کی تمام تر ذمہ داری یونیورسٹی پر ہی عائد ہوتی ہے،

بالکل ایسا ہی ہے جیسے تصویر کے ایک رُخ کو تو اچھی طرح دیکھا جائے اور دوسرے کو نظر انداز ـــــ

میرے خیال میں تمام ذمہ داریاں طلبہ پر ہی عائد ہوتی ہیں۔ اگر وہ محنت سے تعلیم حاصل کریں، تو یونیورسٹی اُن کو شکایت کا موقع ہی نہ دے۔

## م-ط- سال دوئم

مَیں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اس فعلِ عام کی سو فیصدی ذمہ داری ان اربابِ بست و کشاد پر عائد ہوتی ہے جو مختلف اوقات میں تعلیم جیسی اہم ذمہ داریوں پر فائز رہے ہیں اور فائز ہیں۔

# غزل

قمر الزمان قمر

قمرؔ جو وقفِ غمِ آرزو نہیں ہوتے
جہانِ عشق میں وہ سرخرو نہیں ہوتے

تمہاری مدبھری آنکھوں کے مست دیوانے
رہینِ منّتِ جام و سبو نہیں ہوتے

تمہاری کوششیں بیکار ہیں اے چارہ گرو
یہ ہیں وہ زخمِ جگر جو رفو نہیں ہوتے

ہزار طرح کی اچھائیاں ہمیں تسلیم
وفا سرشت مگر خوبرو نہیں ہوتے

ہر ایک سمت اُسی ماہرو کے جلوے ہیں
ہمارے سجدے کبھی قبلہ رُو نہیں ہوتے

# شام و سحر

● المنار کی ادارت سالِ رواں کے لئے — حصۂ اردو کی پروفیسر محبوب عالم خالد ایم۔ اے اور حصۂ انگریزی کی مرزا خورشید احمد صاحب ایم۔ اے کے سپرد کی گئی ہے۔

## مجلسِ ارشاد

صدر :- پروفیسر محبوب عالم صاحب خالد ایم۔ اے

سیکرٹری :- پرویز پروازی۔ سال سوئم !

● اپریل ۱۹۵۶ء سے جنوری ۱۹۵۷ء تک مجلس ہذا کے چار اجلاس منعقد ہوئے جن میں حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی، حضرت سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب، مولانا ابوالعطاء صاحب فاضل اور مولوی عبدالقدیر صاحب شاہد واقفِ زندگی نے اپنے قیمتی خیالات سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ !

## تعلیم الاسلام کالج یونین

عہدیدار — صدر :- جناب نصیر احمد خان ایم۔ ایس۔ سی

نائب " :- عطاء الکریم شاہد

سیکرٹری :- مرزا انس احمد

● اکتوبر ۵۶ء سے جنوری ۵۷ء تک یونین کے کُل آٹھ اجلاس منعقد ہوئے۔ جن میں دو مباحثے، ایک سمپوزیم اور پانچ علمی تقاریر کروائی گئیں۔ برطانوی دارالعلوم کی طرز پر پہلی بار مباحثے کا اہتمام کیا گیا جس میں لاء کالج لاہور کے دو مہمان مقررین مسٹر خالد بشیر اور مسٹر ارشاد کاظمی نے بھی شرکت کی۔ مسئلہ سویز پر سمپوزیم منعقد کیا گیا۔ جس میں کالج کے سات مقررین نے حصہ لیا۔ مصر کے صدر ناصر کی خدمت میں اینگلو فرانسیسی جارحیت کے خلاف ہمدردی کا تار دیا گیا جس پر اُن کی طرف سے شکریہ کا پیغام بھی موصول ہوا۔ اساتذہ میں سے محترم

مظفر حسین صاحب زیدی ایم۔اے نے اور مہمانان میں سے محترم مارس ڈیمبو (سیکنڈ سیکرٹری امریکن ایمبیسی کراچی) اور محترم خالد بشیر صاحب لاء کالج نے اجلاسوں میں تقاریر کیں۔

یونین کی طرف سے گورنمنٹ کالج سرگودھا کے زونل انٹرمیڈیٹ مباحثہ میں کالج کے دو طلباء نے حصہ لیا اور عبدالرشید صاحب نے دوم انعام حاصل کیا۔!

سالانہ مباحثے فروری کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہو رہے ہیں۔ عنادین یہ ہیں:۔

اُردو ——— "امتحانات میں ناکامی کی تمام تر ذمہ داری طلباء پر عائد ہوتی ہے"۔

انگریزی ——— "U.S.A. is lesser evil than Russia"

---

## بزمِ اُردو

عہدیدار ——— صدر:۔ محمد اکرم ۔ سال چہارم

نائب " :۔ محمد اکرم میر " سوم

سیکرٹری:۔ محمد اختر نواز " دوم

نائب " :۔ لطیف احمد قریشی " اول

بزمِ اُردو کے تین اجلاس منعقد ہوئے۔ دو اجلاسوں میں باہر سے ملک کے مشہور ادباء نے اپنے قیمتی مقالات سے حاضرین کو نوازا۔ لاہور سے محترم مولانا صلاح الدین احمد صاحب تشریف لائے۔ آپ نے "ہماری زبان اور ادب کے چند مسائل" کے موضوع پر ایک معلوماتی مقالہ پڑھا جو ہفت روزہ قندیل لاہور میں بزمِ اُردو تعلیم الاسلام کالج کے حوالہ کے ساتھ شائع ہوا۔ (یہ مقالہ شریکِ اشاعت ہے۔ ہم بزمِ اُردو کے ممنون ہیں)۔ محترم ڈاکٹر وزیر آغا صاحب ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی بھی بزمِ اُردو کی دعوت پر تشریف لائے اور آپ نے "اُردو ادب کی اولین شاعری کے دَور میں طنز و مزاح" کے موضوع پر اپنا قیمتی مقالہ پڑھا۔ (یہ مقالہ انشاءاللہ کسی آئندہ اشاعت میں شریک کیا جائے گا۔) توقع ہے کہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی اور سید وقار عظیم ایم۔اے عنقریب بزمِ اُردو کی دعوت پر تشریف لائیں گے۔

---

## سائنس سوسائٹی

عہدیدار:۔ راجہ محمد اسلم صدر!

رفیق احمد اختر سیکرٹری!

سائنس سوسائٹی کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں محترم عبدالمنان صاحب شاہد نے "ٹیکسائیل میں کیمسٹری کی اہمیت" کے موضوع پر تقریر کی۔ آپ حال ہی میں England سے Spinning کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے تشریف لائے ہیں۔

سائنس سوسائٹی کے زیر اہتمام سابق صوبہ سرحد کی صنعت گاہوں اور سائنسی تجربہ گاہوں کی سیر کا ایک پروگرام بنایا گیا تھا جسے جنوری کے پہلے ہفتہ میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ اس میں ۱۲ طلباء اور ایک پروفیسر نے شرکت کی۔!

---

## عربی سوسائٹی

عہدیدار :- صدر - شاہ محمد فیضی

سیکرٹری - محمد صدیق

کُل چھ اجلاس منعقد ہوئے ——— تین اجلاسوں میں باہر سے معزز مہمانانِ کرام تشریف لا کر شریک محترم شیخ محمد احمد صاحب مظہر ایڈووکیٹ لائلپور نے عربی کے اُمّ الالسنہ ہونے کے متعلق دو بار مجلس ہذا کے زیر اہتمام تقریر فرمائی۔ مکرم مولانا چودھری محمد شریف صاحب سابق مبلغ بلادِ عربیہ نے "اسرائیل کا ماضی اور مستقبل" کے موضوع پر طلباء سے خطاب فرمایا۔ مختلف اجلاسوں میں پرویز پروازی صاحب، قریشی ضیاء الحق صاحب اور نذیر احمد صاحب نے اپنے اپنے مقالے پڑھے۔

---

## مجلس اقتصادیات

عہدیدار :- صدر - قاضی محمد اسمٰعیل نائب صدر - ناصر احمد خالد

سیکرٹری - مرزا غلام احمد

ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر زیدی صاحب نے

"Towards a Higher standard of living"

کے موضوع پر ایک معلوماتی تقریر کی۔

---

## مجلسِ نفسیات

عہدیدار :- صدر - محمد رشید اکبر
سیکرٹری - مرزا حنیف احمد

ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں خلیفہ صلاح الدین صاحب نے تقریر کی - عبدالسلام اختر صاحب نے صدارت فرمائی -

## مجلسِ تاریخ

عہدیدار :- صدر - افتخار احمد شہاب
سیکرٹری - سردار علی خان

## مجلسِ فارسی

عہدیدار :- صدر - نثار احمد
سیکرٹری - منظور احمد شاکر

مجلسِ فارسی کے اجلاس میں محترم شیخ محمد احمد صاحب مظہر ایڈووکیٹ نے ''مولانا بسمل کی شاعری'' کے متعلق اپنا قیمتی مقالہ پڑھا - (جو ابھی تک موصول نہ ہونے کی وجہ سے شریکِ اشاعت نہ کیا جا سکا -

## بیالوجی سوسائٹی

عہدیدار : صدر - جمیل احمد صوفی
سیکرٹری - رفیق احمد اختر

صرف دو اجلاس منعقد ہوئے -

## فضل عمر ہوسٹل یونین

عہدیدار :- نائب صدر - محمود احمدؐ

سیکرٹری - الیاس بشیر احمدؐ

سیکرٹری کامن روم - جاوید احمدؐ چوہدری

مختلف اجلاسوں میں طلباء کو دینی اور علمی معلومات بہم پہنچائی جاتی رہیں - پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم - اے نے تقریر فرمائی -

کامن روم ٹورنامنٹ جنوری کے آخری ہفتہ میں شروع ہو رہے ہیں -

---

## سالانہ کھیلیں

(۲۲ - ۲۴ کو منعقد ہو رہی ہیں - نتائج اگلے شمارہ میں درج کئے جائیں گے - انشاء اللہ)

---

(ادارہ)

# قراردادِ تعزیت

فضل عمر ہوسٹل یونین و فضل عمر ہوسٹل مجلس خدام الاحمدیہ کا یہ ہنگامی اجلاس حضرت مفتی محمد صادق صاحبؓ سابق مبلغ امریکہ کی وفات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتی ہے - مرحوم حضرت مسیح پاک علیہ السلام کے فدائی اور سلسلہ کے ایک مخلص خادم تھے آپ نے اپنی تمام عمر خدمتِ اسلام کے لئے صرف کر دی اور بڑے بڑے دنیاوی عہدوں کو ٹھکرا کر اسلام کے لئے وقف ہو گئے ـــــ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحبؓ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کا حافظ و ناصر ہو -

محمود احمدؐ
صدر ہوسٹل یونین